OPEN ACCESS
Al-Duhaa
﴾Journal of Islamic Studies﴿
ISSN (print): 2710-0812
ISSN (online): 2710-3617
www.alduhaa.com

Al-duhaa, Vol.:3, Issue: 1, Jan -June 2022
DOI:10.51665/al-duhaa.003.01.0222, PP: 587-597

اکبر الہ آبادی اور تہذیبی کشمکش 21 صدی کے تناظر میں

Akbar Ala Abadi and Civilization Conflict In the context of the 21st century

Published:
01-06-2022
Accepted:
15-05-2022
Received:
31-12-2021

Dr. Shazia Sajid
Assistant Professor (Urdu Department) Kinnaird College for Women, Lahore
Email: shazia.sajid@kinnaird.edu.pk
https://orcid.org/0155-5200-0001-0009

Abstract

Akbar Ilahabadi felt aggrieved over the erosion of Eastern cultural heritage and values. This is a recurring theme in his poetry, and this article undertakes a critical review of his thoughts on the cultural loss that was taking place in the subcontinent. Using excerpts of his work on this issue, this article then compares and contrasts his thought process to the perspectives of other literary figures living in the same era. Akbar Ilahabadi used his work to criticize the adoption of Western norms and values. He urged his people that adopting a foreign culture will deprive their future generations of a clear understanding of their cultural identity. Using the lens of Akbar Ilahabadi's work, this article attempts to present the dilemma faced by the residents of the subcontinent between the adoption of Western culture and preserving their local culture during the British rule.

Keywords: *Akbar Ala Abadi, Civilization, 21st century.*

تمہید

اکبر الہ آبادی کے صد سالہ یومِ وفات کے موقع پر متعصب ہندو قوم کی طرف سے یہ تحفہ دیا گیا کہ "اکبر" کے "الہ آباد" کا نام "پریاگ راج" رکھ دیا گیا ہے۔ آج پاکستان کی آزاد فضا میں آنکھ کھولنے والی نسل کو "پاکستان کا مطلب کیا" "لا الہ الا اللہ" کے نعرے کی برکات کے لیے اور بھی زیادہ شکر ادا کرنا چاہیے۔

اکبر "الہ آبادی" جن کے الہ آباد کو دو سال پہلے "پریاگ راج" کا نام دے دیا گیا ہے۔ آج اکبر پریاگ راجی زندہ ہوتے تو گاندھی کے مشترکہ ہندوستان کے نظریے کی حمایت پر افسوس کرتے۔

آج بھی اِس خطے میں مسلم شناخت اور تہذیب کی علامتوں پر متعصبانہ حملے کیے جا رہے ہیں۔ انگریز کا ہندوستان پر تسلط اور نوآبادتی نظام نافذ کرنے کی کوششوں کے جواب میں اکبر کی جدوجہد اور مشترکہ دوستان کا نظریہ بالکل اس طرح تھا جیسے ایک ہی چار دیواری میں بسنے والے خاندان میں آپس میں لاکھ اختلافات ہوں۔ مگر جب خاندان سے باہر کوئی فرد اوّل الذکر خاندان کی ناموس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو سب افرادِ خانہ مل کر اپنی مشترکہ عزت کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اکبر کے کلام کا مطالعہ کرنے سے سب سے پہلا تاثر ایسی شخصیت کا اُبھرتا ہے جو مذہب سے بہت لگاؤ رکھتا ہو کیونکہ اپنے کلام میں زیادہ تر انہوں نے زندگی کے ہر معیار کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا ہے مگر حقیقت اس سے کافی مختلف ہے۔ انہوں نے عام تعلیم یافتہ ہندوستانی کی طرح اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اُن کی جدوجہد بڑی متنوع ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ریلوے میں بحیثیت کلرک کی ملازمت کا آغاز کیا مگر احساس تھا کہ یہ منزل نہیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مطالعہ کرتے رہے اور ایک سال بعد ہی وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت کو باقاعدہ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کر لیا۔ ابھی تک جو بھی تعلیم حاصل کی تھی اُس میں انگریزی زبان کو بمطابق ضرورت پڑھا مگر اس پیشے میں آ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ انگریزی زبان کو سیکھنا چاہیے۔ چنانچہ انگریزی کے ساتھ ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا۔ اسی زبان کی مہارت کی بنا پر پہلے سب جج اور پھر جج کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ان کی اس جدوجہد کی تفصیلات سے اَدب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ ان تفصیلات کا اعادہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ انتہائی دنیادار شخص تھے اور عصری تقاضوں کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو برتنے کی استعداد رکھتے تھے۔

ہندوستان میں 1857ء کا معرکہ اکبر کے لڑکپن کا واقعہ تھا۔ مگر انگریز کے تسلط کو مضبوط ہوتے انہوں نے بہت خوب دیکھا۔ پورے خطے کے حالات محض سیاسی سطح پر تبدیل نہیں ہو رہے تھے۔ پورا سماجی اور معاشرتی ڈھانچہ تبدیل ہو رہا تھا۔ مشرقی اقدار و روایات دقیانوسی اور قدیم کہہ کر ترک جا رہی تھیں۔ تہذیب کی اس تباہی کا احساس محض اکبر الہ آبادی کو ہی نہیں تھا۔ 1857ء کے بعد کا اردو ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اکبر الہ آبادی سمیت بہت سے ادباء اور شعراء سمیت دیگر سیاسی رہنما بھی اس تہذیبی زیاں پر اپنے اپنے میدان میں احتجاج کر رہے تھے۔ حالی، شبلی، سرسید سے ہوتے ہوئے اقبال تک ایک لمبی فہرست ان مستقبل شناس رہنمائوں کی جنہوں نے اپنے قلم اور زبان سے اپنے تہذیبی ورثے کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ سب کے پیش نظر احیائے مذہب وملت کا عظیم مقصد تھا۔ 1857ء کے بعد انگریز کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب وہ ہندوستان کو اپنی کالونی بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ مقامی لوگوں سے ذلت آمیز سلوک کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ سفاکیت اور تضحیک آمیز سلوک ہندوستانیوں کا مقدر بن گیا تھا۔ ''گوروں'' کو ہر طرح کی مراعات (جس میں قانونی یا غیر قانونی کی کوئی تخصیص نہیں تھی) حاصل تھیں۔ ''کالا لوگ'' ناانصافی پر احتجاج کرتے تو سخت سزائوں کا سامنا کرتے۔ اکبر الہ آبادی نے ''لسان العصر'' بن کہ اس احتجاج کو طنز ومزاح کی شاعری میں ڈھال لیا۔ صدائے احتجاج کو شاعری میں اس صورت میں ڈھالنے کی یہ وجہ رہی ہو گی کہ وہ سرکاری ملازمت میں تھے۔ براہِ راست حکومتی اداروں کے ساتھ مزاحمتی رویہ نہیں اپنا سکتے تھے۔ اس طرح انہوں نے حکومت کے غلط اور ناانصافی پر مبنی اقدامات کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اپنی زندگی میں اکبر کے کلام کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کا کلام تین جلدوں میں 1909ء سے 1921ء کے درمیان چھپا۔ اکبر کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تک بھی ان کے کلام کو وہ مقبولیت حاصل رہی کہ پہلی جلد 1936ء تک گیارہ بار چھپی۔ کلیات اکبر کی چوتھی جلد کے چھپنے میں بہت

تاخیر ہوئی۔ یہ 1948ء میں کراچی سے چھپی۔ عبدالماجد دریابادی نے اس کے حواشی لکھے۔

بظاہر اکبر کے ذاتی حالات اُن کے کلام سے میل نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے تمام عمر سرکاری نوکر کی۔ 1898ء میں حکومت کی طرف سے ''خان بہادر'' کا خطاب بھی قبول کیا۔ پنشن لیتے رہے، سرسید جیسے رہنمائوں کے ساتھ نظریاتی اختلاف اور گاندھی کے نظریات کی حمایت۔ یہاں تک کہ ''گاندھی نامہ'' کے عنوان سے طویل نظم لکھی۔ یہ دو متضاد رویے بظاہر ناقابل فہم دکھائی دیتے ہیں۔ مگر قابلِ قدر بات یہ ہے کہ انہوں نے جسمانی طور پر انگریز کی ملازمت کی مگر نظریاتی سطح پر اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد ثابت کیا۔ اپنے نظریات کو کسی کا غلام یا پابند نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اسی ملک میں ہزاروں صاحبِ حیثیت والیانِ ریاست، رئیس اور نواب بظاہر آزادی اور خود مختاری کا بھرم رکھنے کے لیے انگریز کو ہر جانہ ادا کرتے تھے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اپنے زمینی آقائوں کی چاپلوسی اور خوشامد کرتے اور اُن کا طرزِ زندگی اختیار کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

سرسید کی ترقی پسند سوچ اور روشن خیالی کا نظریہ جب تک مذہبی عقائد سے متصادم نہ ہوا وہ سرسید کی بہت عزت کرتے تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ ایک بار تو سرسید نے بڑی چاہت اور کوشش سے ان کو علی گڑھ تعینات کروایا تاکہ زیادہ وقت ایک ساتھ گزارنے کا موقع مل سکے۔ سرسید نے مذہب سے متعلق روحانی معاملات کو جب سائنسی استدلال کے احاطۂ عمل میں لانے کی سعی کی تو اکبر کو اس پر سخت اختلاف اس لیے بھی ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مناسب تعلیم و تربیت سے بے بہرہ تھی۔ ناقابل فہم مذہبی موشگافیاں ان کے عقائد کی شکل و صورت کو بگاڑنے کا سبب بن سکتی تھیں۔

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا (1)

تمام اختلافی امور اپنی جگہ مگر سرسید ہوں یا اکبر دونوں کا مقصد اپنی قوم کی زبوں حالی کا چارہ کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بارہا اکبر نے سرسید کی جدوجہد کو بھی سراہا۔

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا (2)

حالی، شبلی اور اپنے دیگر ہم عصر رفقاء کی احیائے ملت کی کوششوں کا اعتراف کیا۔ اگرچہ یہ سب لوگ جس تہذیبی اور سیاسی زوال پر افسوس کر رہے تھے۔ اس کا آغاز تو تقریباً ایک صدی پہلے سے ہو چکا تھا۔ جوں جوں آخری مغل حکمرانوں کی عنانِ حکومت پر گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اُس کے ساتھ ہی ہندوستانی قوم کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

بالخصوص اسلامی اقدار و روایات کا احوال بہت پریشان کن تھا۔ اکبر جیسے مسلمانانِ برصغیر کے دیگر ادباء، شعراء اور سیاسی رہنماء مستقبل کو بھانپ رہے تھے۔

اکبر نے منشی شرف الدین احمد کو لکھا:

''میں خیال کرتا ہوں کہ قوم و مذہب کی افسوس ناک حالت پر عمدہ اشعار جو حالی، شبلی اور میں نے کہے اور نیز بعض دیگر حضرات نے ان کو یکجا کرکے چھپوائے۔ یادگار رہے گا کہ مسلمانوں نے کیا نوحہ کیا تھا۔'' (3)

آگے چل کر اقبال بھی اس نوحہ کنائی میں شریک ہوئے۔ اُن کا اپنا ایک انداز تھا۔ مگر اقبال اور اکبر کا ایک مرکزی نقطہ یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بقا اور سلامتی اس میں ہے کہ وہ مذہب کے ضابطۂ حیات و اخلاق پر عمل پیرا ہو جائیں۔ اکبر اس بات کے قائل ہیں کہ مذہب ہی انسانی تہذیب کی بنیاد تھا اور وہی اس کی تہذیبی بقا کا ضامن ہے۔

انسان کی پیدائش اور وضع قطع کے تمام عوامل اُسے ارضی حیوانات سے مماثل ہی قرار دیتے ہیں۔ ڈارون کا نظریہ اس کی بڑی مثال ہے کہ کس طرح انسان اپنی موجودہ حالت میں بہت سی ارتقائی منازل کو طے کرتا ہوا پہنچا ہے۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے میرے اِک دوست
فکر ہر کس ہمت و است (4)

یعنی ہر انسان اپنی سوچ اور فکر میں حسب استعداد ہی اظہار کر سکتا ہے۔ تاریخ کا ایک مستند بیان یہ ہے کہ مذہب، عقائد اور اخلاقیات ہی ایسے شعبے ہیں جو انسان کو دیگر حیوانات کے گروہوں سے ممیّز اور ارفع بناتے ہیں۔ تہذیب کا براہِ راست تعلق انسان سے ہے جو پہلے انفرادی اور پھر اجتماعی سطح پر منفرد شناخت کا باعث بنتی ہے۔ تہذیب سے مراد ذاتی قوت، تربیت اور پرداخت ہے۔ تہذیب کا تعلق فطرت سے ہے۔ جب کہ تمدن کا تعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے فطرت پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔

تہذیب فکر، نظریے اور تحریر کی پرورش کرتی ہے اور انسان شعور و آگہی کی منازل طے کرتا ہے۔ جب کہ تمدن اُسے مادی ترقی کی طرف مائل بہ عمل کرتا ہے۔

تہذیب کسی قوم یا معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا نام ہے۔ سماجی تعلق رہن سہن، فنونِ لطیفہ، فلسفہ و حکمت، اخلاق و عادات، اقدار و روایات، رسم و رواج اور خاندانی نظام مل کر تہذیب کو تخلیق کرتے ہیں۔ معاشرے کے یہی پہلو تہذیبی معیار کا تعین بھی کرتے ہیں۔ انگریز جب ہندوستان میں آیا تو ہندوستانی کو مغرور، نفاست پسند اور نازک مزاج پایا۔ معاشی خوشحالی بھی اس آسودگی کا باعث تھی۔

تہذیب دراصل عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو کسی پودے یا جھاڑی کی ایسی کانٹ چھانٹ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ جس کانٹ چھانٹ سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو اور اُسے پروان چڑھنے میں معاونت ہو۔ فارسی زبان میں تہذیب کے معنی ''آراستن، پیراستن'' کے ہیں۔ اردو زبان میں تہذیب کا لفظ شائستگی اور سلیقے کے مترادف ہے۔

اقوام عالم کی تہذیبوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر تہذیب کے تقریباً ایک ہی جیسے تشکیلی عناصر ہیں۔ جو مل کر اس کی مجموعی صورت کو اُبھارتے ہیں۔ اُن تشکیلی عناصر میں معیشت، معاشرت، ثقافت، سیاست اور مذہب شامل ہیں۔ ان تمام عناصر کی ترتیب فوقیت کے لحاظ سے ہر معاشرے میں فرق ہو سکتی ہے۔ اکبر الہ آبادی تمام تہذیبی عناصر کو استحکام معاشرہ کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔

گر حبیب میں زر نہیں راحت بھی نہیں

بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں (5)

تہذیب کسی ایک دور یا عہد تا محدود نہیں ہوتی بلکہ ایک تہذیبی ورثے کی حیثیت سے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہے۔ اکبر توانا معیشت، تعلیم، ناموری اور عمدہ نظامِ حکومت کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم خیال کرتے ہیں۔ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و ترویج ہر دور کی نسل کے ذمے ہوتی ہے۔ اخلاقی اقدار کو درخورِ اعتنانہ سمجھنے والی تہذیبیں انسانی تاریخ میں معزز مقام حاصل کرنے سے محروم رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اکبر بلکہ اُس دور کے تمام ادباء اور شعراء اخلاقی عناصر کی تقویت اور بحالی پر اِصرار کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق انسان اپنے سفلی جذبات کو قابو میں رکھے اور انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات میں قانونِ الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے ایک مہذب معاشرے کو پروان چڑھا سکتا ہے۔

وقتی مصلحت کی خاطر اگرچہ اکبر نے بھی انگریزی حکومت کی نوکری کی۔ اپنے آپ کو ایک اچھا سول سرونٹ ثابت کرتے ہوئے انگریز افسرانِ بالا سے اچھے مراسم بنائے۔

یو پی کے چیف سیکرٹری ٹامس برن کے ساتھ ذاتی تعلقات کا فخریہ ذکر کرتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی گولڈن جوبلی پر مدحیہ قصیدہ بھی پیش کیا۔ مگر ہر طرح کے راہ و رسم میں اس بات کا ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنے عقائد یا شناخت پر کوئی سمجھوتہ کیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا جھانسہ دے کر جب انگریز سرکار نے مشرقی تہذیبی ڈھانچے پر وار کیے تو اکبر نے بھانپ لیا کہ نوآبادیاتی نظام کو اس خطے میں رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کا مسئلہ معاشی سے زیادہ تہذیبی و ثقافتی تھا کیونکہ اُن کی تہذیب و ثقافت کا اصلِ اصول ان کا مذہب تھا۔ مغرب یا غیر مسلم اقوام عالم کے ساتھ مسلم اُمہ کی تہذیبی کشمکش کا بنیادی نقطہ یہی تھا۔ نوآبادیاتی نظام میں منفرد شناخت اور تہذیب کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

غور کیا جائے تو حقیقت سامنے آتی ہے کہ مذہب کو انسانی معاشرے میں ایک مدار کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو وہ اپنے پیروکاروں کو اخلاقی نظام کم از کم ضرور دیتا ہے۔ عقائد کے مطابق ضابطہ حیات کا سرسری یا تفصیلی ڈھانچہ بھی موجود ہوتا ہے۔ مگر تمام مذاہب عالم کا نقطۂ اتصال انسانیت کی بھلائی ہے۔ ہر مذہب انسان کو عزت، محبت اور ہمدردی کے لائق سمجھتا ہے اور اُسے اپنی اپنی حدود کے مطابق آزاد اور من پسند زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے۔ معاشرے میں مذہب کی عدم موجودگی انسانی رویوں کو بے راہ رو کر سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے نظام شمسی میں مرکز کے گرد گھومنے والے سیاروں کو مدار کی کشش ایک ہی دائرے میں رکھتی ہے جب کہ جو اجسام فلکی اِس مدار سے باہر ہیں وہ ایسے سفر میں ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔

اکبر الہ آبادی کا مذہب سے لگاؤ ایک حد تک تھا۔ اگرچہ اُن کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی مگر انہوں نے خود کو دنیاوی زندگی میں بھرپور طریقے سے کامیاب بنایا۔ اپنے بیٹے کو تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجا۔ محض مذہبی نقطہ نظر پر اصرار کے باعث اکبر کو قدامت پسند اور قنوطی ٹھہرانا ناانصافی ہے۔ مگر وہ اپنی شناخت اور اقدار و روایات کی قیمت پر جدید ترقی حاصل کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کو اپنی قوم کی زوال پذیر اخلاقیات کی درستی کا ایک ہی راستہ سجھائی دیتا تھا کہ اس کو مذہب کے عطا کردہ اخلاقی اور معاشرتی نظام کی طرف راغب کیا جائے۔ ان کی دانست میں یہی ایک مرکزی نقطہ تھا جس پر عمل پیرا ہو کر اپنی تہذیبی شناخت کو بچایا جاسکتا تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''اگر اُن شعراء میں سے ہیں جو نئی اور پرانی روشنی کی آویزش کو دیکھتے ہیں لیکن وہ کسی ایک کی مکمل اور بے روک ٹوک حمایت نہیں کرتے۔'' (6)

اکبر نقادِ معاشرت ہیں۔ اُنہوں نے مسلم تشخص میں بگاڑ پیدا کرنے والے عناصر کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اس کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حل بھی بتایا۔ اس کائنات کی کوئی شے ثبات کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ کائنات کی فطرت میں حرکت کا عمل رکھ دیا گیا ہے۔ مسلسل حرکت کا لازمی نتیجہ تبدیلی ہے۔ بظاہر ساکت و جامد نظر آنے والے اجسام بھی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ شاید یہ بات انسانی احاطۂ عقل میں سما بھی نہیں سکتی۔ اسی طرح قوموں کا عروج و زوال کائنات کے اس حرکی عمل کا حصہ ہے۔ کوئی قوم مسلسل عروج یا زوال کا شکار نہیں رہ سکتی۔ اصل مسئلہ اس مدوجزرِ حیات میں اپنی منفرد شناخت اور تہذیبی تشخص کو بحال رکھنا ہے۔ اس تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام کی تعلیم انفرادی حیثیت میں خودی اور عزت نفس کے درس اولین سے ہوتی ہے اور مجموعی طور پر تعمیر ملت اس کی اگلی منزل ہے۔ اکبر کا کلام انفرادی تربیت سے لے کر تعمیر ملت تک کے لیے اسلام کے اخلاقی نظام کے خدوخال اُبھارتا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا (7)

انیسویں صدی سائنس کی ترقی کی ابتدا تھی۔ مغربی اقوام نے اس دوڑ میں مذہب اور معاشرے کو الگ الگ کر دیا تھا۔ برصغیر میں انگریز کے تسلط کے بعد اس کی اثرات بڑی تیزی سے آنا شروع ہو گئے۔ تاریخ عالم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کس طرح غالب آجانے والی قوم مغلوب اور کمزور اقوام پر اپنے نظریات کو مسلط کرنے کے لیے ان کے تہذیبی و ثقافتی اقدار کے نظام کو تہ و بالا کر دیتی ہیں۔ اس خطے میں مسلمانوں کا باہمی اتحاد ہی اُن کی اصل طاقت تھا۔ اس پر فرقہ واریت کی ضرب کاری لگائی گئی۔ مائل بہ زوال قوم کو مذہبی تعصب کی طرف راغب کر دیا گیا۔ فرقہ واریت کو ہوا دے کر علماء اور فضلاء کو بے مقصد مباحث میں اُلجھا دیا گیا۔ اس طرح مقامی قوتوں کو استعمال کر کے اس استحصال کی بنیاد ڈالی گئی۔ مغرب جو ہمیشہ سے نفاق، تعصب اور احساس برتری میں مبتلا رہا ہے۔ مشرق اور عالمی سطح پر کمزور اقوام پر معاشی اور سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر کے تسلط کی کوشش میں رہا ہے۔ مارکس کا کمیونزم، مسولینی کا فاشزم، مغربی جمہوریت ہو یا سوشلزم، سب نے مل کر محض برتری کے زعم میں مبتلا اقوام کے لیے کام کیا۔ اس پوری تگ و دو میں خاص طور پر مذہبی نظام کو ختم کرنے کی سعی کی گئی تاکہ بالخصوص مذہب کی ڈوری ہیں بندھے اقوام کے معاشرتی ڈھانچے کو درہم برہم کیا جاسکے اور پھر اپنی مرضی کا نوآبادیاتی نظام دے کر پوری شہری دنیا کو کٹھ پتلی کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ معاشرے کی اکائی یعنی برصغیر میں خاندانی نظام کو تہ و بالا کیا۔ نسوانی حقوق اور بیداری کا نعرہ لگا کر عورت کو انفرادی ترقی کا خواب دکھایا گیا۔ اپنی روشن خیالی کی ایسی دھاک بٹھائی کہ اس کو اپنانے کے لیے پوری ہندوستانی قوم مستعد ہو گئی۔ ملک گیری کی ہوس نے نوآبادیاتی نظام کا روپ دھار لیا تھا۔ مشرق سے مغرب تک کمزور اور مغلوب اقوام کو اپنے معاشی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی غلامی کے جال میں پھنسایا۔ انسانیت کی غم خواری کا فریب دے کر ظلم و استبدادیت کے نئے باب رقم کیے گئے۔ سائنسی ترقی اور زمانے کو جدیدیت کی راہ دکھلا کر ہلاکت کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں حتیٰ کہ سائنس کی ایجادات تک کو تمدنِ نسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کرنے

اور ایک دوسرے کو تباہی کے گھاٹ اُتارنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔" (8)

اکبر الہ آبادی کا دور وہ تھا جس میں بر صغیر میں فکر و عمل کے تین مختلف دھارے شدومد سے جاری و ساری تھے۔ عوام اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان کی اندھا دھند تقلید اور حمایت میں مصروف تھے۔ سب سے پہلا وہ طبقہ جس نے انگریز کی جدیدیت اور روشن خیالی میں چھپے نوآبادیاتی نظام کو قبول کرتے ہوئے ان کے ہر منفی، مثبت اقدام کی حمایت کی نیت باندھ رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مقامی سطح پر عوام کو بھی ان کی حمایت کے لیے قائل کر رہے تھے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جنھوں نے انگریز کی طرف سے آئی ہر مثبت منفی شے کو "کفر" کی مہر لگا کر یکسر رد کر دیا تھا اور اس پورے نظام سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ مگر ان کے عمائدین نے اصلاح مذہب اور احیائے ملت دونوں کے لیے جدوجہد کی۔ تیسرا طبقہ جو ہندوستانی بالخصوص مسلم تشخص کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو انگریز کی پیروی اور خوشامد میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ انگلستان سے تحصیل علم کے بعد ہندوستان میں سرکاری عہدوں پر فائز یہ ہندوستانی اپنے آپ کو انگریز کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس ضرر رسانی سے تو خود اکبر الہ آبادی اور سر سید احمد خان کا گھر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اکبر الہ آبادی کا بڑا بیٹا "ہاشم" تحصیل علم کی خاطر انگلستان گیا۔ پھر وہیں کا ہو رہا۔ انگریز عورت سے شادی کی اور جوانی میں اُسی دیارِ غیر میں انتقال کر گیا۔ سر سید کے بیٹے سید محمود کی بھی مثال موجود ہے کہ جب انگریز سرکار نے صرف انگریزوں کے لیے ہندوستان میں بہت سی مراعات کا اعلان کیا جس سے ہندوستانیوں کو یکسر محروم رکھا گیا تو سید محمود نے ہر طرح سے حکومت کو اپنے انگریز ہونے کا یقین دلایا کہ کس طرح انہوں نے تمام تعلیم و تربیت انگلستان سے حاصل کی ہے اور زندگی کا بڑا حصہ وہیں پر بسر کیا ہے۔ لہٰذا انگریز کو ملنے والی تمام مراعات پر اُن کا بھی حق ہے۔ جب کہ ان کا تعلق اس معاشرے کے ایک متمول اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ پھر اکبر کا یہ سوال کرنا تو جائز تھا۔

ہر چند کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تیری رگوں میں خون بھی ہے (9)

جب ترقی کی خواہش میں خود غرضی آجاتی ہے تو وہ انفرادی سطح تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ قوم و ملت کا درد رکھنے والے اپنا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اکبر کی زندگی کے آخری دور میں انگریز ہندوستان میں تہذیبی سطح پر فتح کے جھنڈے گاڑنے کے قریب تھے۔ سیاسی سطح پر پسپائی اختیار کیے ہوئے تو اس قوم کو مدت گزر چکی تھی مگر آہستہ آہستہ اس تسلط کا دائرہ داخلی اور خارجی زندگی کے تمام پہلوؤں تک پھیل چکا تھا۔ سیاسی، سماجی، فکری، تعلیمی غرض ہر شعبہ معاشرت پر وہ اپنی برتری کو منوانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس تہذیبی المیے کا نوحہ اکبر الہ آبادی اور ان کے شریک کار اگر بلند نہ کیے رکھتے تو شاید قوم کبھی خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہو پاتی۔ اس تہذیبی کشمکش کی جنگ میں اقبال جیسے نابغۂ روزگار بھی شامل ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ بھی مغربی تہذیب کے چنگل سے اپنے آپ کو بچا لائے تھے اور تہذیبی سطح پر عالمی منظر نامہ اُن کے سامنے واضح ہو چکا تھا۔ فرقہ واریت اور طبقاتی تقسیم کے بعد انگریز اپنے نوآبادیاتی نظام کی پس پشت سرمایہ دارانہ نظام کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ تہذیبی تشخص کی بقا کے علمبرداروں پر قدامت پسندی اور دقیانوسیت کی مہر ثبت کی جا رہی تھی۔ سامراجی طاقتوں کے عزائم اہل و نظر اور اہل شعور کے احاطۂ عقل میں آچکے تھے۔ اکبر الہ آبادی جو خود کو کسی نہ کسی طرح اس نظام کا حصہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے تمام عمر انگریز اور ان کی

تہذیب کی مخالفت کو عقیدے کی طرح نبھایا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں۔

''اکبر میں عزتِ نفس کا پاس اور قومی افتخار کا احساس ان کے نکتہ چینوں سے زیادہ تھا اور شاعر کی حیثیت سے انہیں جزئیات میں آنکھ اور انتہائی تیز کاٹ رکھنے والی طباعی ودیعت ہوئی تھی۔ اپنی تاریخ و تہذیب کا ضیاع اور زیاں اُن پر بہت شاق تھا۔ شاید خاص کر اس وجہ سے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح اس نظام کا حصہ ہیں۔'' (10)

اکبر الہ آبادی کی پیشین گوئیاں سچ یا بت ہونے لگیں اور برطانوی حکومت کے بہت سے منفی اقدامات سے ان کے دعوئوں اور وعدوں کی قلعی کھلنے لگی۔ جدید اور خود مختار دوستان کے خواب دکھا کر صدہا قسم کے تنازعات پورے ملک میں پھیلا دیئے گئے۔ قول و فعل کا یہی تضاد اس تہذیبی کش مکش کا باعث بنا۔ انگریز کی سفاکی اور مقامی لوگوں کے ساتھ متعصبانہ رویوں نے کم از کم ان کی اندھا دھند تقلید اور تائید کرنے والے طبقے کو عقل دلا دی۔ اس پر اکبر ہی کیا بہت سے عالم، فاضل حیران تھے۔ گوری رنگت اور انگریزی کا رعب ہندوستانیوں کے دلوں سے معدوم کرنے کے لیے ابھی کافی محنت اور وقت درکار تھا۔

ہندوستان ہمیشہ سے ایک کثیر الثقافت خطہ رہا ہے۔ مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ دورِ حکومت اس خطے کی تاریخ کے ایک وسیع عرصے کو گھیرے ہوئے ہے مگر کسی حکمران نے انگریز کی سی عیاری سے اس خطے کے لوگوں کو ان کی قوم و مذہب کے لحاظ سے انفرادی شناخت یا تہذیبی تشخص کو مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ آٹھ صدیاں کسی بھی قوم کو اپنی تہذیب میں ڈھالنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ برعظیم میں ہندو کا جداگانہ تشخص آج بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ان پر کوئی تہذیبی یلغار نہیں کی۔ مگر انگریز حکومت کی اس مذموم سازش نے ہندوستانی معاشرت کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

مشرقی تہذیب میں مغربیت کی ملاوٹ سے سب سے بڑا نقصان اس اسلامی عقیدے کو پہنچا جو کہ کسی بھی مسلمان کے لیے بقائے حیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہے جہدِ مسلسل، مشاہدہ کائنات اور دعوتِ فکر۔ محکوموں پر کسی بھی فاتح قوم کی سب سے بڑی فتح یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی فکر کو جمود کا شکار بنا دے۔ مشاہدہ اور عمل کے سب راستوں کو مسدود کر دے۔ فکری جمود تہذیبی وجود کی موت ہے۔ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا آغاز سائنس کے چڑھتے ہوئے سورج کا زمانہ تھا۔ مغرب میں اس سورج کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ جب کہ ہندوستان ابھی عقائد اور شناخت میں پھنسا ہوا تھا۔

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی نہ رہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے (11)

ہمدردانِ ملت کے پاس مذہب اور جدیدیت کا کوئی ایسا مکمل امتزاج یا تعلیمی نظام موجود نہیں تھا جو نسل نو کی مناسب تعلیم و تربیت کی استعداد رکھتا ہو۔ کیوں کہ کم از کم ہندوستان میں مغربی حکام کا اثر و رسوخ اس قدر تھا کہ جدید نظام افکار اور دانشوارنہ سائنسی تصورات کو اختیار کرنے کا ہر راستہ انگریز کی تقلید سے ہو کر گزرتا تھا۔ اکبر اس تہذیبی یلغار کے اثرات کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور عظیم تہذیب کی علامتوں کو ملیا ملیٹ کرنے کے لیے تمام طاغوتی طاقتیں متحد ہو چکی تھیں۔ ہندوستان تو ان کے لیے ایک مشق ستم تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کو نشاۃِ ثانیہ

کے جال میں الجھا کر حصے بخرے کر دیا گیا تاکہ کوئی تہذیبی شان و شوکت کی علامت مسلمانوں کو ان کے ماضی کے احیاء پر مائل نہ کر دے۔ اکبر الہ آبادی اپنے خدشات میں کچھ ایسے بھی غلط نہ تھے۔ انگریز حکام کے بہت سے مسلم کُش اقدامات نے ثابت کر دیا کہ نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ مقامی سطح پر ان کا اصل شکار مسلم اُمہ ہی ہے۔ اس خطے میں انہوں نے اس کے ماضی سے وابستہ ہر یاد کو مٹانے کی سعی کی۔ ان کو مسلمانوں احیائے ملت کے جذبے کے اجاگر ہونے کا اندیشہ ان اقدامات پر مائل کر رہا تھا۔ فارسی کا خاتمہ، لارڈ میکالے کا نظام، اردو و ہندی جھگڑا قومی سطح سے عام لوگوں تک ہر طرح کی جزئیات کو معدوم کیا جا رہا تھا۔

ہندوستانی مقامی سرکاری افسران کو اپنے جان نشیں کی حیثیت سے رکھتے تھے۔ ان کی ایسی تربیت کی جاتی تھی کہ ان کے اندر احساس برتری پیدا ہو۔ افسر کے دفتر کے باہر بیٹھے چپڑاسی کو ہندوستانی تہذیب میں عزت و مرتبت کی علامت پگڑی پہنائی گئی جب کہ سرکاری افسر کو انگریزی سوٹ پہننے کا حکم تھا۔ اس طرح معاشرے کو طبقاتی تقسیم کے الجھاؤ میں ڈال دیا گیا۔

جس روشنی میں لوٹ ہی کو آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو اُبھارے
اس کو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا (12)

اکبر الہ آبادی کو محض نقادِ مغرب سمجھنا درست نہیں وہ ملت کا درد رکھنے والے ایک ہمدرد ہیں جو اضطراری کیفیت میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو شاعر کے بجائے مصلح اور حکیم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی بظاہر طنز و مزاح پر مبنی شاعری غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ یہ شاعری مغربی تہذیب اور اس کے تقلید کرنے والوں پر تنقید محض نہیں بلکہ اس خطے میں مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کی معدومیت کا نوحہ بھی ہے۔ ان کی شاعری حال اور مستقبل کی اصلاح کا پورا نظام وضع کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے اکبر نہ ہی مادیت' نہ جمہوریت یا جدید نظام تعلیم کے خلاف تھے۔ بحیثیت ہجو نگار ان کی نظر اپنے عہد کی کمزوریوں پر پڑتی ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کی افادیت کا سرے سے انکار ہے اور وہ ان تمام کو ملک کے لیے ضرر رساں تصور کرتے ہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ انہیں نہ تو مادیت کی افادیت سے انکار ہے اور نہ ہی جدید تعلیم کے فوائد سے۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ ان پر غیر ضروری توجہ نہ دی جائے۔ مذہب اور اخلاق سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے وہ قوم کے لیے مضر ہے۔'' (13)

یہ تہذیبی کش مکش روئے زمین پر انسانی معاشرے کی بنیاد سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ فرد واحد اپنی ذات کے اندر کش مکش کا شکار ہے۔ دراصل یہ کش مکش زندگی کا تسلسل رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ اکبر کا اصرار اس پر ہے کہ عمل کے اس سمندر میں پیراکی کریں مگر اس میں ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ عصری تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہوں نے خود تمام عمر جہد مسلسل کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ وہ کس طرح اپنی قوم کو فکری عملی جمود کا درس دے سکتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اپنا اور دین کا تعلق سمجھنے کی سعی کرے۔ غور و فکر اور مشاہدے کی دعوت عملی میدان میں تحرک کے لیے ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کتابوں کی تعلیم سے شعور و آگہی بھی ہو سکے۔ جب تک مذہب کی رہنمائی نہ ہو دنیاوی تعلیم کل عناصر کی مکمل پرورش نہیں کر سکتی۔ اگرچہ اس سے ہر نفس اپنی

استطاعت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔

عالمی منظر نامے پر تہذیبوں کی یلغار میں اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ عصر حاضر میں جہاں سائنس کی بے باکیاں اس حد تک بڑھ چکیں کہ وہ عظیم فطرت کے ہر عمل میں مدخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ اپنی برتری منوانے کی ہر ممکن کوشش میں ہے۔ یہاں تک کہ مخلوقات کے فطری گروہوں کو مدغم کیا جا رہا ہے۔ کلوننگ کے ذریعے ایک انسان جیسے کئی انسان لیبارٹری میں بنانے کی تگ و دو جاری ہے۔ اس فتنہ آشوب دور میں اپنی تہذیبی شناخت اور تشخص کو برقرار اور منفرد رکھنے کے لیے پہلے سے زیادہ سعی کرنا ہوگی۔ انفرادی سطح سے اجتماعی سطح تک ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اپنی ذات سے آغاز کرکے اپنے خاندان' حلقۂ احباب اور پھر قومی سطح پر اس فریضے کی انجام دہی میں حصہ ڈالنا سب پر فرض ہو چکا۔ سیاسی رہنما ہوں یا ادبی حلقوں کے معززین افرادِ معاشرہ ہوں زندگی کے کسی بھی شعبے کی نمایاں ہستیاں سب پر ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اپنے طریقے سے پاکستانی قوم ہی کو نہیں بلکہ پوری مسلم اُمہ کو اپنا تشخص اور شناخت کی بقا پر راغب کریں ورنہ ہماری آئندہ نسلیں اس تہذیبی ورثے سے محروم ہو جائیں گی۔

ورثہ صرف جائیدادیں اور دیگر دولت دنیا نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا اور قیمتی ورثہ وہ تہذیبی تشخص اور منفرد شناخت ہے جو کوئی ایک نسل اپنی اگلی نسل کو منتقل کرتی ہے۔

تہذیبی کش مکش کا عمل اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جاری و ساری ہے اور رہے گا۔ ''اکبر کا کلام زوال پذیر معاشرے کا تہذیبی نوحہ نہیں تھا۔'' وقت نے اس بیان پر صداقت کی مہر لگادی۔ اکبر الہ آبادی کا کلام ایسی آفاقیت کا حامل ہے جو آئندہ نسلوں کو بھی تہذیبی کش مکش میں بقا اور سلامتی کی راہ سجھائے گا۔

ادب کو اسی لیے تنقید حیات کہا جاتا ہے۔ ہر دور کا ادیب عصری شعور اور اپنی انفرادی استعداد کی آمیزش سے یہ فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اکبر نے اصلاح ملت کا بیڑا اٹھایا' اکبر' اقبال' شبلی' حالی اور دیگر رہنمائوں نے تہذیبی بقا اور ملی شناخت کی جو جدوجہد شروع کر رکھی تھی آج بھی اُسی کارزار میں برسرپیکار ہیں۔ طاغوتی اور سامراجی قوتوں کے وار کو بچاتے ہوئے آج بھی اِس خطے کا تو کیا پوری دنیا میں مسلمان اپنی شناخت کی بقا کی جنگ میں مصروف ہے۔ عصرِ حاضر کی برق رفتاری نے سالہا سال سے ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگوں کو بھی بڑی سرعت سے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے کی استطاعت حاصل کرلی ہے۔ بالکل اسی طرح تہذیب کی جنگ میں بھی تیزی آگئی ہے۔ اب دو کشتیوں کے سوار کے نصیب میں صرف ڈوبنا ہوگا۔ بحیثیت قوم ہمیں جلد فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں مشرق کی کشتی میں سوار ہونا ہے یا مغرب کی۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حواشی و حوالہ جات

1. عابد حسین' سید (مرتب) ''انتخاب اکبر الہ آبادی''، ص: 112
Sayyid, 'ābid Ḥussayn, Itikhāb Akbar Ilāh Ābādī, P: 112

2. ایضاً، ص: 170

Ibid, P: 170

3. محافظ احمد (مرتب) "مکاتیبِ اکبر"، ص: 114

Muḥāfiẓ Aḥmad, Makātīb e Akbar, P: 114

4. عابد حسین، سید (مرتب) "انتخاب اکبر الہ آبادی"، ص:69

Sayyid, 'ābid Ḥussayn, Itikhāb Akbar Ilāh Ābādī, P: 69

5. ایضاً، ص:204

Ibid, P: 204

6. فاروقی، شمس الرحمٰن "نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے اقدار"، ص:34

Fārūqī, Shams al Raḥmān, Naī Tahdhībī Siyāsat awar Badalty Waqt, P: 34

7. عابد حسین، سید (مرتب) "انتخاب اکبر الہ آبادی"، ص:202

Sayyid, 'ābid Ḥussayn, Itikhāb Akbar Ilāh Ābādī, P: 202

8. نذیر نیازی، سید (مرتب) "مکتوباتِ اقبال"، ص: 31

Sayyid, Nadhīr Niyāzī, Maktūbāt e Iqbāl, P: 31

9. عابد حسین، سید (مرتب) "انتخاب اکبر الہ آبادی"، ص:110

Sayyid, 'ābid Ḥussayn, Itikhāb Akbar Ilāh Ābādī, P: 110

10. فاروقی، شمس الرحمٰن "نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے اقدار"، ص: 36

Fārūqī, Shams al Raḥmān, Naī Tahdhībī Siyāsat awar Badalty Waqt, P: 36

11. عابد حسین، سید (مرتب) "انتخاب اکبر الہ آبادی"، ص:247

Sayyid, 'ābid Ḥussayn, Itikhāb Akbar Ilāh Ābādī, P: 247

12. ایضاً، ص:201

Ibid, P: 201

13. محمد صادق، ڈاکٹر "ڈاکٹر الہ آبادی"، ص:149

Dr. Muḥmmad Ṣādiq, Doctor Ilāh Ābādī, P: 149